ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3901

Program: BS (Islamic Studies)

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت اسٹڈیز)

کورس: مطالعہ سیرت مکی ومدنی دور (3901) • سطح: بی ایس (علوم اسلامیہ)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ نمبر 6-9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: غزوہ بدر میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی قید و فدیہ (20 نمبر)

سوال نمبر 1: حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی قید اور فدیہ کے معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ کیا تھا اور اس واقعے نے ان کی نبوت کی سچائی پر کس طرح اثر ڈالا؟

(20)

تعارف

غزوہ بدر رمضان 2 ہجری میں پیش آیا اور اس میں قریش کے ستر کے قریب افراد قیدی بنے، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اس وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا اسلام بظاہر عام نہیں ہوا تھا اور وہ قریش کے لشکر کے ساتھ آئے تھے، روایات میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ وہ دل سے اسلام کی طرف مائل تھے اور مکہ میں مسلمانوں کی خفیہ مدد بھی کرتے تھے، تاہم بدر کے معاملے میں ان کے ساتھ وہی برتاؤ ہوا جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ ہوا۔ یہی نکتہ سوال کا مرکز ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کے معاملے میں کیا رویہ اختیار کیا اور اس واقعے نے آپ کی نبوت کی سچائی پر کیا اثر ڈالا۔ اس جواب میں قید کی صورت حال، فدیے کا فیصلہ، مال کے بارے میں وہ مشہور گفتگو جس میں چھپائے گئے مال کا ذکر آیا اور اس کے ایمانی اثرات کو ترتیب سے بیان کیا جائے گا۔ بات خالص سیرت و تاریخ کے تعلیمی مطالعے تک محدود ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی قید کی صورت حال

بدر کے بعد قیدیوں کو مدینہ لایا گیا اور انہیں صحابہ کے گھروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی جس پر صحابہ کھانے میں بھی انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ ایک مضبوط جسم کے مالک تھے اور روایت کے مطابق جس صحابی کے حصے میں وہ آئے انہوں نے رات کو ان کی رسیاں مضبوطی سے باندھ دیں۔ اس سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کراہتے رہے اور ان کی آواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ کو نیند نہ آئی۔ جب صحابہ کو معلوم ہوا کہ آپ کی بے چینی حضرت عباس کی تکلیف کی وجہ سے ہے تو انہوں نے رسیاں ڈھیلی کر دیں جس کے بعد آپ کو آرام آیا۔ اس واقعے میں دو باتیں بیک وقت نظر آتی ہیں۔ ایک طرف چچا کے لیے فطری محبت اور ان کی تکلیف پر بے چینی ہے، دوسری طرف یہ محبت کسی خصوصی رعایت کی صورت اختیار نہیں کرتی۔ رسیاں ڈھیلی کروانا انسانی ہمدردی تھا، مگر اصولوں میں نرمی نہیں کی گئی۔ یہی توازن آگے فدیے کے فیصلے میں پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔

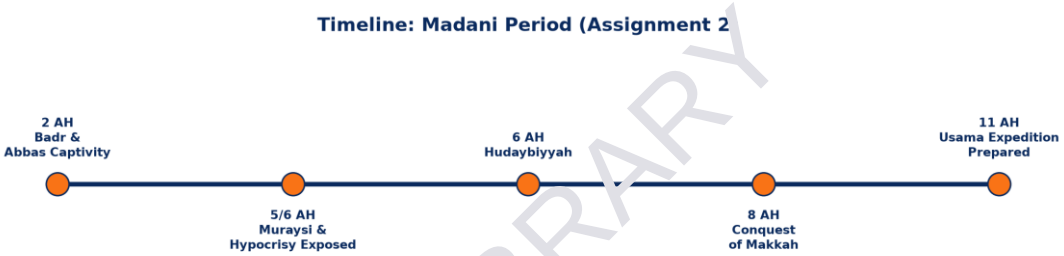
فدیے کے معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ

قیدیوں کے بارے میں مشورہ ہوا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدیہ لے کر چھوڑنے کی رائے دی جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سخت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیے والی رائے قبول فرمائی اور ہر قیدی کے لیے اس کی حیثیت کے مطابق فدیہ مقرر ہوا۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی باری آئی تو انہوں نے عرض کیا کہ میں تو دل سے مسلمان تھا اور مجھے زبردستی لایا گیا تھا، اس لیے مجھ سے فدیہ نہ لیا جائے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سیرت کی کتابوں میں اس مفہوم کے ساتھ منقول ہے کہ آپ کے ظاہر کا فیصلہ ہمارے سامنے ہے اور آپ کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، لہٰذا فدیہ ادا کرنا ہو گا۔ مزید یہ کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے نہ صرف اپنا فدیہ بلکہ اپنے بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث اور اپنے حلیف کا فدیہ بھی ادا کرنے کو کہا گیا کیونکہ وہ اہل ثروت تھے۔ یہ فیصلہ اس اصول کا عملی اعلان تھا کہ قانون اور اصول کے سامنے قرابت کوئی استثنا پیدا نہیں کرتی۔ اگر اس موقع پر چچا کو چھوڑ دیا جاتا تو دشمن بھی طعنہ دیتا اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ خیال آ سکتا تھا کہ اصول صرف کمزوروں کے لیے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

چھپے ہوئے مال کا ذکر اور نبوت کی سچائی

فدیے کی گفتگو میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میرے پاس مال نہیں رہا، اگر فدیہ دوں گا تو عمر بھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کا ذکر فرمایا جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مکہ سے نکلتے وقت اپنی اہلیہ حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا کے پاس چھپا کر رکھا تھا اور جس کی جگہ اور مقدار کی خبر ان دونوں کے سوا کسی کو نہیں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مال کہاں ہے جو آپ نے ام الفضل کے پاس رکھا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں اس سفر میں مارا جاؤں تو یہ مال میرے بچوں کے کام آئے گا۔ یہ سن کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ حیران رہ گئے کہ یہ بات ان کے اور ان کی اہلیہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ اسی موقع پر ان کے دل میں یہ یقین پختہ ہوا کہ یہ خبر وحی کے بغیر ممکن نہیں اور انہوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا جس کا مفہوم روایات میں اس طرح آیا ہے کہ اللہ کی قسم آپ اللہ کے رسول ہیں۔ بعض روایات کے مطابق آپ نے اسی مال سے فدیہ ادا کرنے کی پیشکش بھی کی اور بات اسی مال کے حساب سے طے ہوئی۔ اس واقعے نے قریش تک بھی یہ پیغام

پہنچایا کہ مدینہ میں ہونے والے فیصلے محض سیاسی نہیں بلکہ ان کے پیچھے علم غیب سے متصل وحی کی رہنمائی ہے، بشرطیکہ غیب کا اصل علم اللہ ہی کے پاس ہے اور نبی کو وہی بتایا جاتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔



شکل: مدنی دور کے اہم مراحل کا زمانی ترتیب

واقعے کے اثرات اور اسباق

اس واقعے کا پہلا اثر خود حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زندگی پر پڑا کہ آپ کا اسلام ظاہر ہو گیا اور بعد میں آپ اور آپ کا خاندان اسلام کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کر تا گیا، یہاں تک کہ خلافت عباسیہ آپ ہی کی نسل سے قائم ہوئی۔ دوسرا اثر مسلمانوں پر پڑا کہ ان کا اس اصول پر یقین پختہ ہوا کہ ان کے نبی کے فیصلے عدل پر مبنی ہیں اور قرابت ان میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ تیسرا اثر مدنی ریاست کے نظام پر پڑا کہ قانون کی یکساں تطبیق کی بنیاد پہلے دن سے قائم ہو گئی، جس کا اعلان بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کے مفہوم میں بھی فرمایا کہ اگر محمد کی بیٹی بھی چوری کرے تو اس پر بھی حد قائم ہو گی۔ چوتھا اثر دعوتی تھا کہ اس واقعے کی خبر جب مکہ پہنچی تو بہت سے لوگوں کے دلوں میں نبوت کی سچائی کے بارے میں نئی سوچ پیدا ہوئی۔ طالب علم کے لیے اس واقعے کے اسباق یہ ہیں کہ قیادت کی پہچان ذاتی تعلق کے بجائے اصول کی پاسداری ہے، خاندانی محبت اور قانونی عدل میں کوئی ٹکراؤ نہیں اگر حدود واضح ہوں، اور اللہ اپنے دین کی سچائی کو ایسے واقعات سے ظاہر کر دیتا ہے جو دلوں کو بدل دیتے ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بدر میں قید ہونا بظاہر ایک شکست کا منظر تھا مگر انجام کے اعتبار سے وہ ان کی زندگی کا مبارک موڑ ثابت ہوا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی قید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ محبت اور عدل کا حسین امتزاج تھا۔ چچا کی تکلیف پر آپ بے چین رہے اور رسیاں ڈھیلی کروائیں، مگر فدیے کے معاملے میں کوئی رعایت نہ دی بلکہ بھتیجوں اور حلیف کا فدیہ بھی انہی سے ادا کروایا۔ اسی گفتگو میں چھپے ہوئے مال کے انکشاف نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دل میں نبوت کی سچائی کا یقین پختہ کر دیا اور وہ کھل کر اسلام کا اظہار کرنے لگے۔ اس واقعے نے مدنی معاشرے میں یہ اصول ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا کہ قانون سب کے لیے برابر ہے اور سچائی کا سب سے بڑا ثبوت کردار کی یہی بے لاگ کیفیت ہے۔ طالب علم کو اس واقعے سے عدل، امانت اور اصول پسندی کا وہ سبق ملتا ہے جو سیرت کے مطالعے کا حاصل ہے۔

سوال نمبر 2: غزوہ مریسیع میں منافقت کے مظاہر اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ردعمل (20 نمبر)

سوال نمبر 2: عبداللہ بن ابی اور اس کے پیروکاروں کی منافقت کے مظاہر غزوہ مریسیع کے دوران کس طرح ظاہر ہوئے؟ اس موقع پر حضرت عبداللہ بن ابی بن سلول کے قول مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا کے خلاف اس کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی کا کیا ردعمل تھا اور اس سے اسلامی معاشرتی اصولوں کا کیا درس ملتا ہے؟ (20)

تعارف

غزوہ مریسیع، جسے غزوہ بنو مصطلق بھی کہا جاتا ہے، 5 یا 6 ہجری میں پیش آیا۔ اس غزوے میں فتح تو مسلمانوں کو حاصل ہوئی مگر واپسی کے سفر اور اس کے دوران منافقین کی سازشیں کھل کر سامنے آ گئیں، یہاں تک کہ سورۃ المنافقون نازل ہوئی جس میں ان کے اقوال اور انجام کا ذکر موجود ہے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول مدینہ کے قبیلہ خزرج کا سردار تھا اور اسلام کی آمد سے پہلے اسے مدینہ کا بادشاہ بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اس کا یہ خواب ختم ہو گیا، اسی لیے وہ دل میں اسلام کا دشمن رہا اگرچہ ظاہر میں مسلمان بن کر رہتا تھا۔ سوال کے تین حصے ہیں کہ اس غزوے میں منافقت کے مظاہر کس طرح ظاہر ہوئے، عبداللہ بن ابی کے

مشہور قول کے خلاف اس کے سچے مسلمان بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ردعمل کیا تھا اور اس پورے واقعے سے اسلامی معاشرتی اصولوں کا کیا درس ملتا ہے۔ یہ واقعہ خالص تاریخی و تعلیمی حیثیت میں بیان کیا جارہا ہے؛ اس سے کسی موجودہ شخص یا گروہ پر منافقت کا حکم لگانا ہرگز اس گائیڈ کا مقصد نہیں، کیونکہ دلوں کے فیصلے اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔

غزوے کا پس منظر اور کنویں کا جھگڑا

بنو مصطلق کی طرف سے مدینہ پر حملے کی تیاریوں کی اطلاع ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لشکر لے کر پیش قدمی فرمائی اور مریسیع کے کنویں کے قریب مقابلہ ہوا جس میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ فتح کے بعد قیام کے دوران پانی پر ایک معمولی جھگڑا پیش آیا۔ ایک مہاجر صحابی حضرت جہجاہ رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی حضرت سنان رضی اللہ عنہ کے درمیان کنویں پر دھکم پیل اور تلخ کلامی ہو گئی اور دونوں نے اپنے اپنے گروہ کو آواز دی۔ یہ صورتِ حال قبائلی عصبیت کو بھڑکانے کے لیے کافی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً تشریف لائے اور اس جاہلانہ پکار کو ختم کرنے کا حکم دیا اور بات رفع دفع ہو گئی۔ مگر عبداللہ بن ابی نے اس واقعے کو موقع سمجھا اور اپنی مجلس میں وہ باتیں کہیں جو اس کے دل کی چھپی دشمنی کو ظاہر کرنے والی تھیں۔ اس نے مہاجرین کے بارے میں نازیبا مثال دی اور پھر وہ تاریخی جملہ کہا جس کا مفہوم تھا کہ مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا، جس سے اس کی مراد اپنی دانست میں خود کو عزت والا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کو، نعوذ باللہ، دوسری طرف رکھنا تھا۔

منافقت کے دیگر مظاہر

اس غزوے میں منافقت صرف ایک جملے تک محدود نہیں رہی۔ پہلا مظہر یہ تھا کہ فتح اور مالِ غنیمت کے وقت منافقین آگے آگے تھے مگر ان کی زبانوں سے ناشکری اور طعنہ زنی جاری رہی۔ دوسرا مظہر یہ تھا کہ واپسی کے سفر میں تیز آندھی کے موقع پر بھی بعض منافقین نے بددلی پھیلانے کی کوشش کی۔ تیسرا اور خطرناک ترین مظہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کا واقعہ ہے جو اسی سفر سے واپسی پر پیش آیا اور جس میں عبداللہ بن ابی سب سے آگے تھا۔ اس واقعے میں ایک پاک دامن ہستی پر الزام لگا کر پورے مسلم معاشرے کو ایک مہینے تک شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا گیا، یہاں تک کہ سورۃ النور کی آیات نے بریت اور اصول دونوں واضح کر دیے۔ چوتھا مظہر یہ تھا کہ منافقین کی

کوشش رہی کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان پرانی عصبیت زندہ کی جائے تاکہ متحد جماعت اندر سے ٹوٹ جائے۔ ان مظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقت کا اصل ہتھیار تلوار نہیں بلکہ زبان، افواہ اور تقسیم پیدا کرنا ہوتا ہے، اور اسی لیے مدنی سورتوں میں اس گروہ سے بار بار خبردار کیا گیا۔

جدول: غزوہ مریسیع میں منافقت کے مظاہر

مظہر	صورت	نتیجہ
عصبیت بھڑکانا	لوگوں کے جھگڑے کو ہوا دینا	رسول اللہ ﷺ نے فوراً ختم کیا
طعنہ آمیز قول	عزت و ذلت والی بات	سورۃ المنافقون میں جواب نازل ہوا
بہتان افک	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام	سورۃ النور میں بریت اور قانون سازی
تقسیم کی کوشش	انصار و مہاجرین میں پھوٹ	جماعت کی وحدت برقرار رہی

واقعے کی اطلاع اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوب

عبداللہ بن ابی کا جملہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے سنا جو اس وقت کم عمر صحابی تھے۔ انہوں نے یہ بات اپنے چچا تک اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی۔ عبداللہ بن ابی نے حاضر ہو کر قسم کھا کر انکار کر دیا اور بعض انصار نے بھی اس کی حمایت میں کہا کہ لڑکے سے غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ اس مرحلے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جذبات میں کوئی اقدام نہیں کیا بلکہ انتظار فرمایا اور لشکر کو فوراً کوچ کا حکم دے کر لوگوں کو سفر میں مشغول کر دیا تاکہ بحث اور تناؤ ختم ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سخت اقدام کی اجازت چاہی تو بھی آپ نے فتنے سے بچنے کو ترجیح دی کیونکہ دنیا یہ کہتی کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ آخر کار وحی نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی تصدیق کر دی اور سورۃ المنافقون میں اس قول کا ذکر اس مفہوم کے ساتھ آیا کہ عزت تو اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے مگر منافقین جانتے نہیں۔ اس اسلوب سے قیادت کا وہ اصول ملتا ہے کہ داخلی فتنے میں عجلت کے بجائے تصدیق، حکمت اور جماعت کی ساکھ کا تحفظ مقدم رکھا جاتا ہے۔

بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ردعمل

اس واقعے کا سب سے ایمان افروز پہلو عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا کردار ہے جو خالص اور مخلص مسلمان تھے۔ جب لشکر مدینہ کے قریب پہنچا تو آپ رضی اللہ عنہ مدینہ کے دروازے پر تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور اپنے والد سے فرمایا کہ اللہ کی قسم آپ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ خود اپنے منہ سے یہ اقرار کریں کہ آپ ذلیل ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزت والے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے آپ کے بارے میں کوئی اور حکم دیں۔ والد حیران رہ گیا کہ خزرج کے سردار کو اس کا اپنا بیٹا شہر میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ والد کو آنے دیں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں جب تک وہ ہمارے درمیان ہیں۔ اس پر بیٹے نے راستہ چھوڑ دیا۔ اس ردعمل میں کئی باتیں جمع ہیں۔ ایک یہ کہ بیٹے کی وفاداری اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ والد کی محبت سے بڑھ کر تھی۔ دوسری یہ کہ بیٹے نے قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لیا بلکہ آخری فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑا۔ تیسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیٹے کی غیرت کی قدر کرتے ہوئے والد کے لیے نرمی کا حکم دیا، جس سے اس خاندان کی عزت بھی محفوظ رہی اور اصول بھی قائم رہا۔

اسلامی معاشرتی اصولوں کا درس

اس واقعے سے پہلا درس یہ ملتا ہے کہ عزت کا اصل معیار تقویٰ اور ایمان ہے، نہ نسب، نہ دولت اور نہ عہدہ۔ دوسرا درس یہ ہے کہ رشتے کی محبت حق کی محبت کے تابع ہوتی ہے، بیٹا والد کی خدمت کا پابند ہے مگر اللہ اور رسول کی توہین پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ تیسرا درس یہ ہے کہ معاشرے کی وحدت کی حفاظت ہر فرد کی ذمہ داری ہے اور عصبیت کی پکار جاہلیت قرار دی گئی ہے۔ چوتھا درس یہ ہے کہ الزام اور افواہ کے معاملے میں تحقیق لازم ہے اور بے ثبوت بات آگے بڑھانا معاشرتی جرم ہے، جس کی تفصیل سورۃ النور اور سورۃ الحجرات میں موجود ہے۔ پانچواں درس قیادت کی حکمت کا ہے کہ اندرونی مخالف کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو جماعت کے مفاد اور شریعت کے اصول کے مطابق ہو، ذاتی انتقام کا کوئی تصور نہیں۔ چھٹا درس یہ ہے کہ نوجوان نسل اگر ایمان میں پختہ ہو تو وہ معاشرے کی حفاظت کا ذریعہ بنتی ہے، جیسے حضرت زید بن ارقم اور حضرت عبداللہ رضی

اللہ عنہما دونوں اس واقعے کے مثبت کردار ہیں۔ ان اسباق کو آج کے طالب علم کے لیے اس حد تک سمجھنا کافی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں سچائی، وحدت اور تحقیق کو اصول بنائے، باقی تطبیق کا فیصلہ ہر معاملے میں اہل علم اور ذمہ دار اداروں پر ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ غزوہ مریسیع میں منافقت کنویں کے جھگڑے، طعنہ آمیز تو، ہتان اور تقسیم کی کوشش کی صورت میں کھل کر سامنے آئی، مگر وحی اور نبوی حکمت نے اسے ناکام بنا دیا۔ عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ ثابت کر دیا کہ مومن کی سب سے بڑی وفاداری اللہ اور اس کے رسول سے ہوتی ہے۔ ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی نے یہ بھی سکھا دیا کہ اصول کی سختی ذاتی انتقام نہیں ہوتی۔ اس پورے واقعے نے مدنی معاشرے کو عزت کا صحیح معیار، وحدت کی قدر اور افواہ سے بچنے کا قانون دے دیا۔ طالب علم کے لیے یہ واقعہ سیرت کے ان ابواب میں سے ہے جو کردار سازی میں سب سے زیادہ اثر رکھتے ہیں۔

سوال نمبر 3: صلح حدیبیہ کی شرائط اور مسلمانوں کی قبولیت (20 نمبر)

سوال نمبر 3: حدیبیہ کے مقام پر طے پانے والے معاہدہ کی شرائط کیا تھیں؟ مسلمانوں نے ان شرائط کو کیوں قبول کیا؟ (20)

تعارف

صلح حدیبیہ ذیقعدہ 6 ہجری کا وہ عظیم واقعہ ہے جسے قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا، حالانکہ بظاہر اس دن مسلمان عمرے کیے بغیر واپس لوٹے تھے اور معاہدے کی شرائط بظاہر قریش کے حق میں جاتی معلوم ہوتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں عمرے کا اشارہ پا کر تقریباً چودہ سو صحابہ کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ ساتھ قربانی کے جانور تھے اور احرام باندھا گیا تھا تاکہ واضح ہو کہ مقصد جنگ نہیں عمرہ ہے۔ قریش نے داخلے سے روک دیا اور طویل گفت و شنید کے بعد حدیبیہ کے مقام پر معاہدہ طے پایا۔

سوال کے دو حصے ہیں، معاہدے کی شرائط کیا تھیں اور مسلمانوں نے بظاہر سخت شرائط کو کیوں قبول کیا۔ اس جواب میں شرائط کو جدول سمیت واضح کیا جائے گا اور پھر قبولیت کے اسباب اور نتائج کا تجزیہ کیا جائے گا، کیونکہ حدیبیہ کا اصل سبق یہی ہے کہ وقتی ظاہری نقصان کے پیچھے دیرپا کامیابی پوشیدہ ہو سکتی ہے۔

معاہدے تک پہنچنے کے واقعات

مکہ کے قریب پہنچ کر قریش نے خالد بن ولید کی قیادت میں دستے بھیجے اور آپ کو روکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ بدل کر حدیبیہ میں پڑاؤ کیا۔ آپ نے کئی قاصد بھیجے تاکہ قریش کو یقین دلایا جائے کہ مقصد صرف عمرہ ہے۔ آخر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ ان کی واپسی میں تاخیر ہوئی اور افواہ پھیل گئی کہ انہیں شہید کر دیا گیا ہے، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخت کے نیچے صحابہ سے بیعت لی جسے بیعت رضوان کہا جاتا ہے اور قرآن میں اس بیعت پر اللہ کی رضا کا ذکر آیا ہے۔ اسی دوران خبر آئی کہ افواہ غلط تھی اور پھر قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو معاہدہ کرنے آیا۔ معاہدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحریر کیا۔ لکھنے کے دوران بھی دو مرتبہ بحث ہوئی، پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے الفاظ پر اور پھر محمد رسول اللہ کے الفاظ پر، اور دونوں مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل کی بات مانتے ہوئے الفاظ بدلنے کی اجازت دی۔ یہیں سے مسلمانوں کے لیے آزمائش شروع ہوئی کہ شرائط فیصلے کی روح کے خلاف محسوس ہو رہی تھیں۔

معاہدے کی شرائط

جدول: صلح حدیبیہ کی اہم شرائط

بظاہر اثر	مضمون	شق
دونوں طرف امن	دس سال تک جنگ نہیں ہو گی	جنگ بندی
بظاہر تاخیر	مسلمان اس سال عمرہ نہیں کریں گے، اگلے سال تین	اس سال واپسی

	دن کے لیے آئیں گے	
بظاہر یک طرفہ	مکہ سے آنے والے کو واپس کیا جائے گا، مدینہ سے جانے والے کو واپس نہیں کیا جائے گا	واپسی کی شق
بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف بنے	کوئی قبیلہ جس فریق کے ساتھ چاہے معاہدہ کرے	قبائل کی آزادی
امن کی ضمانت	اگلے سال ہتھیار میانوں میں ہوں گے، قریش شہر خالی کریں گے	عمرے کی شرائط

ان شرائط میں سب سے زیادہ آزمائش واپسی والی شق پر ہوئی اور اسی دن اس کا عملی امتحان بھی آ گیا۔ سہیل بن عمرو کے اپنے بیٹے ابو جندل رضی اللہ عنہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچ گئے اور فریاد کی کہ مجھے بچالو۔ سہیل نے معاہدے کا حوالہ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو جندل کو صبر کی تلقین کر کے واپس کر دیا، ساتھ یہ بشارت بھی دی کہ اللہ ان کے اور ان جیسے کمزوروں کے لیے راستہ بنائے گا۔ یہ لمحہ صحابہ کے لیے ناقابل برداشت حد تک دردناک تھا۔ اس کے بعد جب معاہدہ مکمل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو قربانی کر کے احرام کھولنے کا حکم دیا تو دکھ کی شدت سے ابتدا میں تعمیل میں تاخیر ہوئی۔ پھر آپ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مشورے سے خود قربانی کی اور احرام کھولا تو سب نے پیروی کی۔ ان واقعات سے شرائط کی ظاہری کڑواہٹ کا اندازہ ہوتا ہے، اس لیے سوال کا دوسرا حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اتنی سخت شرائط آخر کیوں قبول کی گئیں۔

مسلمانوں نے شرائط کیوں قبول کیں

پہلی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ وحی کی رہنمائی میں تھا اور صحابہ کی تربیت یہ تھی کہ اختلاف رائے کے بعد حکم نبوی پر سر تسلیم خم کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا مگر جواب ملنے پر وہی سب سے بڑے اطاعت گزار ثابت ہوئے اور بعد میں اس اظہار پر ندامت میں کثرت سے نیکیاں کرتے

رہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر وقتی جذبات پر نہیں بلکہ دعوت کے مستقبل پر تھی۔ دس سال کی جنگ بندی مل جائے تو اسلام کا پیغام پرامن ماحول میں عرب کے ہر قبیلے تک پہنچ سکتا تھا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس معاہدے سے قریش نے پہلی مرتبہ مدینہ کی اسلامی ریاست کو ایک برابر کی فریق کے طور پر تسلیم کر لیا تھا، یہ وہ سیاسی کامیابی تھی جو کسی جنگ سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ بظاہر یک طرفہ واپسی والی شق کا نقصان بھی عارضی تھا، کیونکہ مکہ سے بھاگ کر آنے والے مسلمان خود ایک ایسی قوت بن گئے جس نے آخر کار قریش کو ہی ارش کے خاتمے کی درخواست پر مجبور کر دیا۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصل منزل مکہ کی فتح نہیں بلکہ ہدایت کا پھیلاؤ تھا اور صلح اس مقصد کے لیے جنگ سے بہتر ذریعہ تھی۔

شرائط قبول کرنے کے نتائج

نتائج نے ثابت کیا کہ حدیبیہ واقعی فتح مبین تھی۔ جنگ بندی کے دو سالوں میں اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد پچھلے انیس سالوں سے بڑھ گئی۔ عرب قبائل نے آزادانہ طور پر مسلمانوں سے ملاقاتیں کیں اور اسلام کو قریب سے دیکھا۔ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص جیسی بڑی شخصیات اسی عرصے میں اسلام لائیں۔ بنو خزاعہ کے حلیف بننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب قریش کے حلیف بنو بکر نے ان پر حملہ کیا اور قریش نے مدد کی تو معاہدہ ٹوٹ گیا اور یہی سبب فتح مکہ کا راستہ بنا۔ سورۃ الفتح کا نزول واپسی کے سفر میں ہوا جس میں بیعت کرنے والوں کے لیے رضا، سکینہ اور قریبی فتح کی بشارتیں دی گئیں۔ ان حقائق کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے شرائط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت پر اعتماد کی وجہ سے قبول کیں اور تاریخ نے اس اعتماد کو درست ثابت کیا۔ طالب علم کے لیے اس میں قیادت پر اعتماد، صبر اور طویل مدتی سوچ کا بڑا درس موجود ہے۔

نتیجہ

اختتام پر کہا جا سکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کی شرائط میں دس سالہ جنگ بندی، اس سال واپسی، اگلے سال مشروط عمرہ، آنے والے کی واپسی اور قبائل کی آزادی شامل تھیں۔ یہ شرائط بظاہر سخت تھیں مگر مسلمانوں نے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم، دعوت کے وسیع مفاد اور اسلامی ریاست کی تسلیم شدہ حیثیت کی وجہ سے قبول کیا۔ انجام یہ ہوا کہ یہی صلح فتح مکہ کی تمہید بن گئی اور قرآن نے اسے فتح مبین کا نام دیا۔ سیرت پڑھنے والے کے لیے حدیبیہ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ کامیابی ہمیشہ فوری اور ظاہری نہیں ہوتی،

بعض اوقات صبر سے قبول کیا گیا ایک سخت فیصلہ آئندہ کی سب سے بڑی فتح کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم حدیبیہ کو اسلامی تاریخ کے فیصلہ کن موڑوں میں شمار کرتے ہیں۔

سوال نمبر 4: فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا داخلہ اور تلاوت (20 نمبر)

سوال نمبر 4: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں داخلہ کس انداز میں ہوا؟ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی آیات کی تلاوت فرمائی؟ (20)

تعارف

فتح مکہ رمضان 8 ہجری کا وہ عظیم واقعہ ہے جس میں وہ شہر جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت پر مجبور کیا گیا تھا، بغیر بڑی خونریزی کے فتح ہو گیا۔ صلح حدیبیہ کے ٹوٹنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً دس ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور مکہ کے قریب پہنچ کر مختلف سمتوں سے داخلے کا اہتمام فرمایا۔ سوال دو حصوں پر مشتمل ہے کہ مکہ میں داخلہ کس انداز میں ہوا اور اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی آیات کی تلاوت فرمائی۔ اس واقعے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فتح فاتحانہ غرور کی نہیں بلکہ عاجزی، شکر اور عام معافی کی فتح تھی۔ اس جواب میں پہلے پس منظر اور تیاری، پھر داخلے کی کیفیت، پھر تلاوت کی گئی آیات کے حوالے اور مفہوم اور آخر میں حرم میں داخلے کے بعد کے اقدامات بیان کیے جائیں گے۔

فتح مکہ کا پس منظر اور حکمت عملی

صلح حدیبیہ کے بعد بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے تھے۔ بنو بکر نے رات کے وقت بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور قریش نے ہتھیاروں اور آدمیوں سے ان کی مدد کی، یوں معاہدہ ٹوٹ گیا۔ بنو خزاعہ کا وفد مدینہ آیا اور مدد کی فریاد کی۔ قریش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ابو سفیان تجدید معاہدہ کے لیے مدینہ آیا مگر ناکام لوٹا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری کا حکم دیا مگر منزل کو خفیہ رکھا تاکہ مکہ میں خونریزی کے بغیر کام ہو جائے۔ دس ہزار کا لشکر مکہ کے قریب مر الظہران میں اترا

تو آپ کے حکم سے ہر شخص نے الگ الگ آگ جلائی، جس سے وادی آگ سے بھر گئی اور اہل مکہ پر لشکر کی عظمت واضح ہو گئی۔ ابو سفیان اسی رات حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ حاضر ہوا، اسلام قبول کیا اور اسے یہ اعزاز بھی دیا گیا کہ جو شخص اس کے گھر میں پناہ لے گا وہ بھی محفوظ ہو گا۔ یہ حکمت عملی اس لیے اختیار کی گئی کہ فتح طاقت کے زور کے ساتھ رحم کے اعلان سے مکمل ہو، اور نتیجہ یہی ہوا کہ شہر تقریباً پرامن طور پر فتح ہو گیا۔

داخلے کا انداز: عاجزی کا منظر

داخلے کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور مختلف راستوں سے مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا، ساتھ سختی سے تاکید کی کہ جو ہتھیار نہ اٹھائے اس سے لڑائی نہ کی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس دستے کے ساتھ تھے جو بالائی مکہ کی طرف سے داخل ہوا۔ داخلے کے وقت آپ کی کیفیت سیرت کا سب سے ایمان افروز منظر ہے۔ ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے داخل ہونے کے بجائے آپ اونٹنی قصواء پر اس طرح سوار تھے کہ سر مبارک اللہ کے شکر اور عاجزی سے اتنا جھکا ہوا تھا کہ ٹھوڑی کجاوے کے قریب آ گئی تھی۔ لباس اور انداز میں کوئی شاہانہ نمائش نہیں تھی۔ یہ وہی شہر تھا جہاں آپ کو اذیتیں دی گئیں، آپ کے ساتھیوں کو شہید کیا گیا اور آپ کو قتل کی سازش تک کی گئی، مگر فتح کے دن زبان پر انتقام کا ایک لفظ بھی نہیں تھا۔ آپ کی آمد پر اعلان ہو رہا تھا کہ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ محفوظ ہے، جو ابو سفیان کے گھر داخل ہو جائے وہ محفوظ ہے اور جو مسجد حرام میں آ جائے وہ محفوظ ہے۔ اس اعلان نے اہل مکہ کے دلوں سے خوف نکال دیا اور وہی لوگ جو کل تک دشمن تھے، شکر گزار بن گئے۔

داخلے کے وقت تلاوت کی گئی آیات

سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں فتح مکہ کے موقع پر دو مقامات کی تلاوت کا خاص طور پر ذکر ملتا ہے۔ پہلا مقام سورۃ الفتح ہے۔ روایات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوتے ہوئے سورۃ الفتح کی تلاوت فرما رہے تھے اور اس کی آیات کو ترجیع کے ساتھ یعنی خوش الحانی سے دہراتے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ اس سورت کا آغاز اس مفہوم سے ہوتا ہے کہ اللہ نے آپ کو کھلی فتح عطا فرمائی ہے۔ یہ تلاوت اس لیے بھی مناسب تھی کہ یہ سورت حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی اور اس میں جس فتح کی بشارت دی گئی تھی وہ آج آنکھوں کے سامنے پوری ہو رہی تھی۔ دوسرا مقام سورۃ بنی اسرائیل یعنی سورۃ الاسراء کی آیت 81 ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کہہ دیجیے حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے

شک باطل مٹنے ہی والا ہے۔ اس آیت کی تلاوت کا ذکر خاص طور پر اس وقت کے ساتھ جوڑا جاتا ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں داخل ہوئے اور کعبہ کے گرد رکھے گئے بتوں کو اشارے سے گرانے کا آغاز ہوا۔ دونوں مقامات کا مفہوم یہاں حوالے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، آیت کا متن نقل نہیں کیا گیا۔ ان آیات کی تلاوت سے واضح ہوتا ہے کہ فتح کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی کامیابی نہیں بلکہ اللہ کے وعدے کی تکمیل اور حق کی سربلندی قرار دیا۔

تلاوت کے انتخاب میں ایک گہرا پیغام بھی موجود ہے۔ سورۃ الفتح شکر، مغفرت اور نعمت کی تکمیل کی سورت ہے جبکہ سورۃ الاسراء کی آیت حق و باطل کے ابدی اصول کا اعلان ہے۔ ایک طرف فاتح اپنے رب کا شکر ادا کر رہا ہے اور دوسری طرف باطل نظام کے خاتمے کا اعلان ہو رہا ہے۔ اس امتزاج سے اسلامی فتح کا تصور واضح ہوتا ہے کہ اس میں نہ ذاتی انتقام ہے اور نہ محض علاقے کا قبضہ، بلکہ شکر گزاری کے ساتھ باطل کا خاتمہ اور حق کا قیام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داخلے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسی طرف توجہ دی جس کے لیے یہ فتح حاصل ہوئی تھی، یعنی کعبہ کو شرک کی علامتوں سے پاک کرنا اور توحید کا مرکز بحال کرنا۔

حرم میں داخلہ، طواف اور عام معافی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں داخل ہوئے، حجر اسود کو چھڑی کے اشارے سے چھوا اور اونٹنی پر سوار رہ کر طواف کیا۔ اس وقت کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت رکھے تھے۔ آپ اپنے ہاتھ کی چھڑی سے ان کی طرف اشارہ فرماتے تو وہ گر پڑتے اور اسی دوران سورۃ الاسراء کی مذکورہ آیت کی تلاوت جاری تھی۔ طواف کے بعد آپ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے، وہاں کی تصویریں اور علامتیں مٹائی گئیں اور نماز ادا کی گئی۔ پھر وہ تاریخی لمحہ آیا جب اہل مکہ مسجد میں جمع تھے اور اپنے انجام کے منتظر تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تمہیں کیا گمان ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا، انہوں نے کہا کہ خیر کی امید ہے کیونکہ آپ کریم بھائی اور کریم بھائی کے بیٹے ہیں۔ اس پر آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اپنے بھائیوں سے کہے گئے طرز پر عام معافی کا اعلان فرمایا کہ آج تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔ چند مخصوص افراد اس عام معافی سے مستثنیٰ رکھے گئے تھے جن کے جرائم سنگین تھے، مگر ان میں سے بھی کئی کو بعد میں معافی مل گئی۔ اسی دن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی چھت پر اذان دی اور مکہ توحید کے مرکز کی حیثیت سے بحال ہو گیا۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں داخلہ عاجزی، شکر اور رحمت کا بے مثال مظاہرہ تھا۔ سر جھکا ہوا تھا، زبان پر سورۃ الفتح اور سورۃ الاسراء کی آیت کی تلاوت تھی، فیصلہ عام معافی کا تھا اور مقصد کعبہ کی تطہیر تھا۔ دنیا کی تاریخ میں فاتحین کے داخلے عموماً قتل عام اور لوٹ مار سے یاد کیے جاتے ہیں، مگر فتح مکہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اصل عظمت انتقام میں نہیں بلکہ معاف کرنے میں ہے۔ طالب علم کے لیے اس واقعے کا سبق یہ ہے کہ کامیابی کے وقت غرور کے بجائے شکر اختیار کیا جائے، دشمن کے ساتھ بھی عدل اور رحم کا معاملہ کیا جائے اور ہر کامیابی کو اللہ کی عطا سمجھا جائے۔ یہی سیرت نبوی کا وہ پہلو ہے جو دلوں کو فتح کرتا ہے اور یہی فتح مکہ کی اصل فتح تھی۔

سوال نمبر 5: سریہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ: پس منظر، تیاری اور اثرات (20 نمبر)

سوال نمبر 5: سریہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا پس منظر، اس کی تیاری اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے اس پر ہونے والے اثرات کا تفصیل سے تجزیہ کریں۔

(20)

تعارف

سریہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سیرت نبوی کے آخری ایام کا اہم واقعہ ہے۔ یہ وہ لشکر ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں شام کی سرحد کی طرف روانگی کے لیے تیار کیا، اس کی قیادت ایک نوجوان صحابی حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سونپی، اس کے بارے میں بعض حلقوں میں چہ مگوئیاں بھی ہوئیں جن کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت سے پہلے اور مرض کے دوران بھی جواب دیا، اور پھر آپ کی وفات کی وجہ سے یہ لشکر عارضی طور پر رک گیا جسے بعد میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے پہلے فیصلوں میں سے ایک کے طور پر روانہ کیا۔ سوال کے تین حصے ہیں، پس منظر کیا تھا، تیاری کیسے ہوئی اور وفات نبوی سے اس پر کیا اثرات پڑے۔ اس جواب میں تینوں حصوں کا تجزیہ تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے گا اور آخر میں اس واقعے کے اسباق کا خلاصہ بیان کیا جائے گا۔

پس منظر: موتہ، حضرت زید رضی اللہ عنہ کی شہادت اور سرحدی صورت حال

اس سریے کا پس منظر غزوہ موتہ 8 ہجری سے جڑا ہے۔ موتہ میں حضرت اسامہ کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور آزاد کردہ صحابی تھے، شہید ہوئے تھے۔ ان کے بعد حضرت جعفر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما بھی شہید ہوئے۔ رومی اقتدار کے زیر اثر عرب قبائل کی طرف سے سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف جارحیت اور مدینہ کے سفیروں کے ساتھ بدسلوکی کے واقعات بھی پیش آ رہے تھے۔ عرب کے شمالی سرحدی علاقے میں امن قائم کرنا اور ان قبائل کو یہ پیغام دینا ضروری تھا کہ مدینہ کی ریاست کمزور نہیں ہے۔ اسی پس منظر میں 11 ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی سمت ایک لشکر تیار کرنے کا حکم دیا جس کا رخ بلقاء اور داروم کی طرف بتایا جاتا ہے اور جس میں حضرت اسامہ کو وہی علاقہ دکھانے کا مقصد بھی تھا جہاں ان کے والد شہید ہوئے تھے۔ یہ مقصد ذاتی انتقام کی صورت میں نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ریاستی سرحد کے تحفظ اور جارحیت کے سدباب کے طور پر سمجھا چاہیے، کیونکہ اسلام میں جنگ کا مقصد فتنہ و جارحیت کا خاتمہ ہوتا ہے، کسی فرد کی ذاتی خواہش نہیں۔

قیادت کا انتخاب اور اس پر گفتگو

اس لشکر کی سب سے نمایاں بات حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی امارت تھی۔ آپ کی عمر اس وقت اٹھارہ سے بیس سال کے درمیان بیان کی جاتی ہے اور لشکر میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور دیگر بڑے صحابہ بھی شامل تھے۔ بعض لوگوں نے کم عمری کی بنیاد پر اسامہ کی امارت پر سوال اٹھایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات پہنچی تو آپ نے بر سر منبر واضح فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اسامہ کی امارت پر طعن کرتے ہو تو تم نے اس سے پہلے اس کے باپ کی امارت پر بھی طعن کیا تھا، حالانکہ وہ امارت کے اہل تھے اور یہ بھی اہل ہے اور یہ مجھے سب سے محبوب لوگوں میں سے ہے۔ اس فرمان سے دو اصول نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہ قیادت کا معیار اہلیت اور اعتماد ہے، عمر اور خاندانی درجہ بندی نہیں، اگرچہ تجربہ کار لوگ موجودگی میں نوجوان کا انتخاب غیر معمولی تھا۔ دوسرا یہ کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی سابقہ حیثیت، یعنی آزاد کردہ غلام ہونے کو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیادت کی راہ میں رکاوٹ تسلیم نہیں کیا۔ یہ اسی انقلابی اصول کی آخری جھلک تھی جو اسلام نے سماجی درجہ بندی کے خلاف قائم کیا تھا۔

جدول: سریہ اسامہ کے مراحل

مرحلہ	تفصیل	اہم نتیجہ
پس منظر	موتہ میں حضرت زید کی شہادت اور سرحدی جارحیت	لشکر کی ضرورت پیدا ہوئی
تیاری	جرف میں پڑاؤ اور حضرت اسامہ کی امارت	بڑے صحابہ نوجوان امیر کے تحت جمع ہوئے
تاخیر	مرض الموت اور وفات نبوی	روانگی عارضی طور پر رک گئی
تکمیل	حضرت ابو بکر نے لشکر روانہ کیا	مشن مکمل کر کے واپسی ہوئی

بیماری اور مرض الموت کے دوران صورت حال

حکم کے مطابق لشکر مدینہ سے باہر جرف کے مقام پر جمع ہونے لگا۔ اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کا آغاز ہوا اور اس میں شدت آتی گئی۔ بیماری کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اس لشکر کی روانگی کی تاکید فرماتے رہے۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اسامہ کے لشکر کو روانہ کرو۔ یہ تاکید بتاتی ہے کہ اس مشن کو آپ محض ایک عارضی کارروائی نہیں سمجھتے تھے بلکہ مدنی ریاست کے تسلسل اور سرحدی امن کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ دوسری طرف صحابہ کی ایک فطری کیفیت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کے دنوں میں مدینہ چھوڑ کر جانا ان کے لیے مشکل تھا۔ اسی کشمکش میں روانگی سست رہی اور پھر وفات کی خبر آ گئی۔ یہاں ایک نکتہ تحقیق کا ہے کہ بعض روایات میں لشکر کی تعداد اور راستے کی تفصیلات میں اختلاف ملتا ہے، اس لیے طالب علم کو اصل واقعے کی مشترکہ بنیاد پر توجہ رکھنی چاہیے، یعنی تیاری مکمل ہونے کے قریب تھی، قیادت طے تھی اور روانگی وفات کی وجہ سے رک گئی تھی۔

وفات نبوی کے اثرات

وفات کا سب سے فوری اثر یہ ہوا کہ لشکر رک گیا اور مدینہ واپس آ گیا، کیونکہ ریاست کا مرکز ہی اس صدمے سے گزر رہا تھا۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ وفات کی خبر کے ساتھ ہی عرب کے کئی قبائل میں ارتداد اور بغاوت کی لہر اٹھی اور مدینہ پر حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ایسی صورت میں بڑے صحابہ میں سے بعض کی رائے یہ ہوئی کہ لشکر کو فی الحال روک لیا جائے یا اس کی قیادت بدل دی جائے تاکہ مدینہ کا دفاع مضبوط رہے۔ تیسرا اثر قیادت کے سوال کی صورت میں آیا کہ حضرت اسامہ کی امارت برقرار رہے یا نہیں۔ ان تینوں معاملات میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف تاریخ ساز تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جس لشکر کا جھنڈا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہو اسے ابو بکر نہیں کھولے گا اور جس امیر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا ہو اسے میں تبدیل نہیں کروں گا۔ لشکر روانہ ہوا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خود کچھ دور تک پیدل چل کر رخصت کرنے گئے جبکہ حضرت اسامہ سوار رہے، اور خلیفہ نے امیر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنے پاس روکنے کی اجازت مانگی جو امیر نے دے دی۔ یہ منظر نبوی فیصلے کے احترام اور نئی قیادت کی عاجزی دونوں کی دلیل ہے۔

وفات کے بعد کے اثرات کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ لشکر کی روانگی نے دشمنوں کو واضح پیغام دیا کہ نبوت کے بعد بھی ریاست کا نظام قائم ہے اور فیصلے تسلسل سے نافذ ہوتے ہیں۔ لشکر اپنے مشن میں کامیاب ہو کر تقریباً چالیس دن میں واپس آیا اور اس عرصے میں مدینہ محفوظ رہا۔ بعض اہل علم اس روانگی کو فتنہ ارتداد کے مقابلے میں نفسیاتی برتری کا سبب بھی قرار دیتے ہیں، کیونکہ اطراف کے قبائل نے دیکھا کہ مدینہ دفاعی سستی کا شکار نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے میں اگر لشکر روک لیا جاتا تو یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ وفات کے بعد فیصلے بدل گئے ہیں اور ریاست انتشار میں ہے۔ اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ سریہ اسامہ محض ایک عسکری کارروائی نہیں رہی بلکہ نبوی نظام کے تسلسل کا امتحان بن گئی جس میں خلافت راشدہ کی پہلی قیادت کامیاب اتری۔

نتیجہ

مجموعی تجزیہ یہ ہے کہ سریہ اسامہ کا پس منظر موتہ کی شہادتوں اور شمالی سرحد کی صورت حال سے بنا، اس کی تیاری میں نوجوان قیادت کا انتخاب اور بڑے صحابہ کی شرکت اسے منفرد بناتی ہے اور وفات نبوی نے اسے عارضی تعطل کے بعد ایک اصولی فیصلے میں بدل دیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس لشکر کو روانہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ سیرت نبوی کے فیصلے کسی شخص کی موجودگی سے مشروط نہیں ہوتے بلکہ ادارہ اور نظام انہی اصولوں پر چلتا رہتا ہے۔ طالب علم کے لیے اس واقعے کے اسباق یہ ہیں کہ قیادت میں اہلیت دیکھی جاتی ہے، بڑے فیصلوں میں جذبات کے بجائے اصول کی پیروی کی جاتی ہے اور مشکل ترین حالات میں بھی دیانت دار قیادت تسلسل قائم رکھتی ہے۔ یہی اس سریے کا اصل پیغام ہے جو اسے سیرت کے آخری ابواب میں خصوصی اہمیت دیتا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com